Fikr-o-Nasar vol.1: 7-8 (1964)

تاریخ اسلام میں اہلِ حَلّ وعَقد کا تصوّر

محمد خالد مسعود

اہل حل وعقد کے تصوّر نے بالکل ابتدائی سالوں میں ہی تاریخ اسلام کو پیش آنے والے بہت بڑے بحران سے بچا لیا۔ اسلامی نظریۂ حیات نے ابھی کسی منظم سماجی ادارے کی شکل اختیار نہیں کی تھی کہ حکومت کا ادارہ اچانک وجود میں آگیا۔ تحریکِ اسلام کا یہ نازک ترین مرحلہ تھا کیونکہ طاقت کے ایک دم ظہور سے یہ اندیشہ تھا کہ یہ کہیں ایسے دیو کی صورت نہ اختیار کر لے جس پر اس کے خالق کو بھی اختیار نہ رہے بلکہ وہ خود اپنے خالق پر تصرف کرے اور اپنے لئے آپ قانون وضع کرے۔ اگر یہ ابتدائی دور خلفائے راشدین کے مدبر ہاتھوں میں نہ ہوتا، جو جمہور امت کے اہل حل وعقد ہونے کے عقیدے کے قائل تھے (۱) تو عین ممکن تھا کہ یہ اندیشہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔

نظریۂ حیات کی نشو ونما کے لئے ضروری ہے کہ قوت واقتدار کو نظریۂ حیات کے تابع رکھا جائے۔ ابتدائی دور میں عملاً یہ صورت ناممکن نہیں تو مشکل ضرور نظر آتی تھی۔ کیونکہ اقتدار کو متوازن رکھنے کے لئے کوئی متوازی ادارہ موجود نہیں تھا۔ اگر اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہوتا جو اسلامی نظریۂ حیات کی برتری کے قائل نہ ہوتے تو یہ صورت ناممکن ہی ہو جاتی۔ لیکن خلفائے راشدین حریتِ رائے، اجتہاد اور شوریٰ کی قدروں پر محکم عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے

دورِ نبوی کی حریت رائے کی روح کو زندہ رکھا اور شوریٰ کو اس قدر اہمیت دی کہ اس نے آہستہ آہستہ اجماع کے ادارے کی ایک ابتدائی شکل اختیار کرلی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی مستحکم ہوتا گیا کہ اقتدار و حکومت شریعت کے تابع ہے۔

اقتدار کے شریعت کے تابع ہونے کے عقیدے سے اسلام کی عالمگیریت کا تصور زیادہ مضبوط ہوا کیونکہ قرآن و سنت کی اساس پر قائم ہونے والی شریعت میں وہ لچک موجود تھی جو ہر قوم اور ہر زمانے کے لوگوں کی رہنمائی کرسکتی تھی۔ اسی سے وہ اعلیٰ اور ارفع وحدت قائم ہوسکتی تھی جو مختلف رسوم و رواج کے لوگوں کو یکجا کرسکے۔ وہ لچک دورِ نبوی کی پروردہ روحِ اجتہاد تھی۔ اسی کی ایک شکل شوریٰ تھی۔

ابتدائی دور میں شوریٰ کے عملی نفاذ سے ہی اقتدار کی اجارہ داری پر بندش ممکن ہوگئی۔ شوریٰ کا یہی تصور آخر میں اجماع کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور انہی اہلِ اجماع کو بعد میں اہلِ حل و عقد کہا جانے لگا۔ ہم آئندہ سطور میں قدرے تفصیل سے اسی تصور کا تجزیہ پیش کریں گے۔

اس تصور نے اگرچہ کبھی واضح اور منظم ادارے کی شکل اختیار نہیں کی، لیکن یہ تصور اسلام کی سیاسی تاریخ میں بنیادی طور پر ہر جگہ موجود رہا ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اوائل میں اسے شوریٰ کا نام دیا گیا۔ تیسری خلافت کے انتخاب کے لئے شوریٰ کا ادارہ پہلی دفعہ واضح صورت میں قائم بھی ہوا لیکن اس کے بعد تاریخ میں ایسی منظم صورت میں نظر نہیں آتا۔ اس کے اسباب کیا تھے؟ اس سوال سے ہم ذرا آگے چل کر بحث کریں گے۔

شوریٰ نے کب چل کر "اہلِ حل وعقد" کی صورت اختیار کی؟ اور یہ اصطلاح کب مستعمل ہوئی؟ ہمیں سب سے پہلے اس سوال پر غور کرنا ہے۔ اس ادارے کے لئے اور بھی کئی نام استعمال ہوئے ہیں۔ جن کو تاریخی ارتقا سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ سیاسیین نے اپنے نظریات کے اعتبار سے ان اصطلاحات کو استعمال کیا ہے۔ زیادہ مستعمل اور شناسا الفاظ ولاۃ الامر[۲]، اهل الشوریٰ[۳] اهل الرائے[۴]، اهل الاجماع[۵] اور اهل الشوکہ[۶] ہیں۔ لیکن متاخرین میں اہلِ حل وعقد کی اصطلاح اتنی مقبول ہوگئی کہ دوسرے الفاظ تقریباً متروک ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکیب اتنی موزوں تھی کہ جونہی کسی نے پہلی بار استعمال کیا علمانے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن اسے سب سے

پہلے کس نے استعمال کیا؟ یہ طے کرنا ذرا مشکل ہے۔ بہر طور مطالعہ اور تحقیق سے ہم نے جو نتیجہ نکالا ہے اس کے لحاظ سے سب سے پہلے امام ابوالحسن علی اشعری (متوفی ۳۳۰ھ) کے ہاں اس کا استعمال ملتا ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ اسے اھل الشوریٰ کے بدل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

وثبتت امامة علی بعد عثمان بعقد من عقد له من الصحابة من اهل الحل والعقد، ولانه لم یدع احد من اهل الشوری غیرہ فی وقته۔	حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علی کی امامت صحابہ میں سے اہل حل وعقد حضرات کی بیعت سے ثابت ہوتی ہے اور اس لئے بھی کہ اہل شوریٰ نے حضرت علی کے سوا کسی کو خلافت کے لئے دعوت نہیں دی"۔

بعد میں یہ اصطلاح اشاعرہ میں اکثر مستعمل رہی۔ مثلاً ماوردی، جوینی اور اسفرائینی وغیرہ نے اسے کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ ان کا ذکر آئندہ سطوروں میں ہوگا۔

اجماع کی بحث میں فقہا کے لئے اھل الاجماع کا سوال سب سے اہم تھا۔ چنانچہ اصولیین اس ضمن میں بڑی تفصیلات میں جاتے ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ہاں بھی اہل کلام کی طرح بتدریج اہل حل وعقد کی اصطلاح راہ پاتی ہے۔ سیف الدین آمدی (متوفی ۶۳۱ھ) اجماع سے بحث کرتے ہوئے اہل حل وعقد کے اتفاق کو شرط قرار دیتے ہیں[8]۔ متاخرین اصولیین کے ہاں تو اجماع کی تعریف ہی ان الفاظ میں کی جانے لگی ہے۔

الاجماع هو اتفاق اهل الحل والعقد من هذه الامة فی امر من الامور	اجماع سے مراد اس امت کے اصحاب حل وعقد کا کسی امر پر اتفاق ہے[9]۔

قرآن میں "اولو الامر" انہی معنوں میں آیا ہے۔ تابعین کے دور میں عام طور پر اس سے محض اصحاب امر وحکومت مراد لئے جاتے تھے۔ لیکن اس دور میں بھی جابر بن عبداللہ، مجاہد، علی بن ابی طلحہ، عطا بن السائب اور الربیع عام انداز سے ہٹ کر "اہل علم وفقہ" مراد لیتے تھے[10]۔ بعد میں اس مفہوم کو اور وسعت ملی۔ اور مفسرین نے بتدریج اہل حل وعقد کی اصطلاح کو اپنا لیا۔ یہاں تک کہ فخرالدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) کے نزدیک اولی الامر اور اہل حل وعقد

مترادف ٹھہرے۔

قولہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم یقتضی وجوب طاعۃ جملۃ اہل الحل والعقد من الامۃ۔	آیت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم یہ تقاضا کرتی ہے کہ امت کے تمام اہلِ حل وعقد اصحاب کی اطاعت واجب ہے[11]۔

اس اصطلاح کا پہلے پہل چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں مستعمل ہونا معنی خیز ہے۔ اگر اس وقت کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ عین منطقی معلوم ہوتا ہے۔

امام اشعری کی وفات ۳۳۰ھ میں متقی باللہ کے عہد میں ہوئی۔ ان دنوں اسلامی سلطنت سخت انتشار میں مبتلا تھی۔ خلافت اپنا وقار کھو چکی تھی۔ یہ انتشار خلیفہ متوکل (۲۴۷ھ) کی وفات سے شروع ہوا۔ اس کے بڑے بیٹے منتصر نے ترک فوجی جرنیلوں کی مدد سے اپنے باپ کو قتل کیا اور تخت خلافت پہ متمکن ہوا۔ اس کا وزیر فتح بن خاقان تھا۔ منتصر نے ۲۴۸ھ میں وفات پائی ترکوں کے ہاتھوں میں اس کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا جانشین مستعین باللہ (۲۵۰ھ) تو مکمل طور پہ ترکوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا۔ چنانچہ سیوطی کہتا ہے۔

خلیفۃ فی قفص بین وصیف و بغا یقول ما قالا لہ کما تقول الببغا	خلیفہ وصیف اور بغا، ترک فوجی افسروں کے ہاتھوں قفس میں ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں، بولتا ہے جیسے طوطی بولتا ہے[12]۔

[درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ہرچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم]

ترک جرنیلوں نے اسے بھی جلد معزول کر دیا اور اس کی جگہ معتز کو تخت خلافت پہ بٹھایا۔ خلفا میں سے کوئی بھی اس قدر کم سنی میں تخت پر نہیں بیٹھا[13]۔ خلیفہ کا ذاتی وقار اب بالکل ختم ہو چکا تھا ابن الطقطقی نے اس ضمن میں ایک بہت ہی دلچسپ لطیفہ نقل کیا ہے جس سے اس وقت کی حالت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

"معتز تخت پہ بیٹھا، تو دربار کے امرا نے حسب دستور نجومیوں کو بلا بھیجا۔ ان سے پوچھا کہ خلیفہ کتنی عمر پائے گا؟ کوئی ظریف الطبع بھی دربار میں موجود تھا۔ اس نے کہا نجومیوں کی بجائے یہ سوال ترکوں سے دریافت کرنا چاہیے[14]۔"

یہ ترک اپنی خواہش سے خلفا کا عزل ونصب کرتے۔ مونس خادم، مقتدر کے عہد کا ایک ممتاز امیر تھا۔ اس نے مقتدر کے خلاف بغاوت کی اور تخت پر قبضہ کر کے اسے معزول کر دیا۔ اور آخر ۳۲۰ھ میں اس نے بڑی بے رحمی سے مقتدر کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد قاہر باللہ (۳۲۰ - ۳۲۲ھ) جانشین ہوا۔ لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا اور مونس نے اسے بھی معزول کر دیا۔ عباسی سلطنت کا یہ دور انتہائی انتشار کا دور تھا۔ کئی خود مختار طاقتیں ابھر رہی تھیں، جس سے عباسی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے خلیفہ راضی (۳۲۲ - ۳۲۹ھ) نے اس کی اصلاح کے لئے فوج کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دبانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے امیر الامرا کا ایک نیا عہدہ مقرر کیا۔ بصرہ کا گورنر ابن رائق پہلا امیر الامرا مقرر ہوا۔ جلد ہی اندرونی طور پر ابن رائق ایک آمر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور اس کی گرفت خلیفہ پر اتنی مضبوط ہو گئی کہ اس نے خلیفہ سے عملی طور پر تمام اختیارات چھین لئے۔

راضی کو ابن رائق کا یہ اقتدار بے حد ناگوار گذرا۔ اس نے اس کی جگہ ابن بجکم کو متعین کر دیا۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں اور ابنِ رائق کی بڑھتی ہوئی گرفت کمزور پڑ سکے لیکن ابنِ رائق زیادہ طاقتور تھا۔ ان کے درمیان ۵ سال تک خونریز لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر اس نے ابن بجکم کو بری طرح شکست دے کر قتل کر دیا اور خود سیاہ وسفید کا مالک ہو گیا۔

یہ ہے امام اشعری کے زمانے کا ایک سرسری جائزہ۔ یہ مطالعہ بتلاتا ہے کہ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ ان حالات سے متاثر ہو کر لوگ امرا اور فوجی جرنیلوں کے متعلق سوچنے لگے ہوں کہ انھیں حل وعقد کے اختیارات حاصل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح انہی دنوں رائج ہوئی اور اس زمانے میں عوام میں اس کا استعمال بہت عام ہو چکا ہوگا۔ اس لفظ کے مفہوم میں ایک با اختیار قوت کا تصوّر موجود ہے۔ اسی لئے اس کا استعمال وہیں رہتا ہوتا ہے جہاں فوجی طاقت برسرِ اقتدار ہو چنانچہ اشعری نے پہلے پہل ان الفاظ کو اسی سیاق میں استعمال کیا ہے۔ وہ خلفائے اربعہ کی امامت سے بحث کرتے ہوئے صرف حضرت علیؓ کی خلافت کے بارے میں اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں۔

فقد حصل الاجماع والاتفاق على امامة ابی بکر الصدیق واذا ثبتت امامة الصدیق ثبتت امامة الفاروق لان	ابو بکر صدیقؓ کی خلافت پر سب کا اجماع اور اتفاق ہو گیا۔ جب صدیقؓ کی امامت ثابت ہو گئی تو فاروقؓ کی امامت بھی ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ

الصديق نص عليه معقداله الامامة فاختاره لها وكان افضلهم بعد ابی بکر وثبتت امامة عثمان بعد عمر بعقد من عقد له الامامة من اصحاب الشوری الذین نص علیهم عمر فاختاروه ورضوا بامامته وثبتت امامة علی بعد عثمان بعقد من عقد له من الصحابة من اهل الحل والعقد ولانه لم یدع احد من اهل الشوری غیره فی وقته ۔

حضرت صدیقؓ نے اس کی تنصیص فرمائی تھی اور فاروقؓ کو نامزد کیا تھا اور یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد وہی افضل الصحابہ تھے۔ پھر حضرت عثمانؓ کی امامت اصحاب شوریٰ کے عقد سے ثابت ہوئی جن کو حضرت عمرؓ نے نامزد کیا تھا۔ انھوں نے آپ کا انتخاب کیا اور آپ کی امامت پر رضامند ہوگئے۔ حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کی بیعت صحابہ میں سے اہل حل وعقد حضرات کے عقد سے ثابت ہوئی کیونکہ انھوں نے اس زمانے میں حضرت علیؓ کے سوا کسی کو خلافت کی دعوت نہیں دی[15]

تاریخی جائزہ

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے یہ ادارہ پہلے پہل حضرت عمرؓ نے تیسری خلافت کے انتخاب کے لئے قائم کیا۔ اسے مجلس شوریٰ کا نام دیا گیا۔ پہلے دو خلفا کا انتخاب اس مجلس کے ذریعہ نہیں ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں عمل میں آیا اور حضرت عمرؓ نامزد ہوئے۔ ان دو خلفا کا انتخاب کرنے والے لوگ مدینہ کے ممتاز مہاجر اور انصار تھے۔ لیکن انتخاب کا باقاعدہ ادارہ پہلے پہل حضرت عمرؓ ہی نے تجویز کیا۔

حضرت علیؓ کا انتخاب انتہائی نازک حالات میں ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد لوگ حضرت علیؓ کے پاس خلافت کی پیش کش لے کر آئے۔ حضرت علیؓ نے ان کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان میں اصحاب شوریٰ شامل نہیں تھے۔ ابن قتیبہ اس واقعہ کی پوری تفصیل دیتے ہیں اور حضرت علیؓ کی یہ گفتگو نقل کرتے ہیں۔

فاتوا علیا فی داره ۔ فقالوا

لوگ حضرت علیؓ کے گھر آئے اور کہا

نبایعك فمد یدك، لابد من امیر فانت احق بها۔ فقال: لیس ذلك الیکم، انما ھو لاھل الشوریٰ واھل بدر فمن رضی بہ اھل الشوریٰ واھل بدر فھو خلیفۃ۔	ہم آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ ہاتھ بڑھایئے ایک نہ ایک امیر ہونا ضروری ہے۔ اور آپ سب سے زیادہ اہل ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تمہارا کام نہیں۔ یہ کام اہل شوریٰ اور اہل بدر کا ہے جس کی خلافت پر یہ لوگ رضامند ہو جائیں وہی خلیفہ ہوگا۔[16]

دوسرے مورخین نے بھی اس واقعہ کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ طبری نے بھی حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت کی تفصیل درج کی ہے۔ اس کے نزدیک مہاجرین اور انصار اہل انتخاب تھے۔ جنھوں نے سب سے پہلے بیعت کی اور ان کے حلف کے بعد عام لوگ بیعت کے لئے آئے چنانچہ وہ لکھتے ھیں۔

فلما دخل المھاجرون والانصار فبایعوہ، ثم بایعہ الناس۔	جب مہاجرین اور انصار بیعت میں داخل ہو چکے تب عام لوگوں نے بیعت کی۔[17]

یہ شوریٰ کا دور تھا جب اقتدار اموی خاندان میں منتقل ہوا حل وعقد کے اختیارات بھی اموی خاندان کے سربرآوردہ لوگوں کے ہاتھ میں آگئے۔ اسی دوران میں یزید کی تخت نشینی کا سوال اٹھا۔ اگرچہ اموی برسر اقتدار تھے لیکن شوریٰ کا تصور، خواہ وہ موہوم سا ہی کیوں نہ ہو، ابھی موجود تھا۔ اور مدینہ کے لوگوں کی بیعت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ حضرت معاویہ اور یزید نے اہلِ مدینہ کی رضامندی حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن حضرت حسینؓ اور ابن زبیر برابر مخالف رہے۔ کربلا کے حادثہ نے اہل مدینہ کی اس رہی سہی طاقت کا تصور بھی ختم کر دیا۔ اور حل وعقد کے اختیارات مکمل طور پر امویوں کے ہاتھ میں آگئے۔ مروان کا انتخاب قبیلۂ کلب کی طویل جد و جہد کے بعد عمل میں آیا۔ لیکن اس کے بعد ولی عہد کی نامزدگی اور موروثی خلافت کے رواج نے یہ اختیار عملی طور پر امرائے سلطنت سے چھین لیا تھا۔ تاہم ملکی امور میں انھیں کافی دخل تھا اور بعض اوقات وہ خلیفہ کو اس کی رائے بدلنے پر مجبور بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی نامزدگی اسی طرح عمل میں آئی۔ سلیمان بن عبد الملک کو رجاء بن حیوٰۃ شامی کندی نے مجبور کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی بجائے عمر بن عبد العزیزؒ کو نامزد کرے۔[18] ۷۵۰ء تک

قبیلہ بنوکلب کا عمل دخل رہا۔ بنوامیہ کے آخری خلیفہ مروان نے کوشش کی کہ یہ اختیارات نفری قبیلہ میں منتقل ہو جائیں۔ لیکن یہ زوال کے ایام تھے اور وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ دریں اثنا عباسی بنوامیہ کی خلافت ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اب یہ اختیارات خاندان عباسی میں منتقل ہو گئے۔ لیکن حقیقتاً سیاسی اصولوں کے لئے خلافت ایرانی عنصر کی مرہون منت تھی۔ کیونکہ انہی کی مدد سے عباسی برسر اقتدار آئے تھے۔ منصور نے مکہ میں خطبہ دیتے وقت کہا :۔

ایھا الناس۔ انما انا سلطان اللّٰہ فی ارضہ، اسوسکم بتوفیقہ، وتسدیدہ وتائیدہ و حارسہ علی مالہ، اعمل فیہ بمشیئتہ وارادتہ واعطیہ باذنہ، فقد جعلنی اللّٰہ علیہ قفلا۔

اے لوگو میں اللہ کی زمین پر اس کا سلطان ہوں۔ اس کی توفیق، تفویض اور تائید سے تم پر حکومت کرتا ہوں میں اس کے مال پر اس کی طرف سے نگران ہوں۔ اس کی مشیت اور ارادے کے مطابق عمل کرتا ہوں اس کی اجازت سے ہی عطایا دیتا ہوں۔ کیونکہ اللہ نے اپنے خزانے پر مجھے قفل بنا کر بھیجا ہے۔[19]

اس خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خلافت میں خود نظریۂ خلافت میں تبدیلی آگئی تھی۔ ایرانی لوگ بادشاہت کے آسمانی ہونے کے قائل تھے اور بادشاہ کے حقوق آسمانی کا عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس طرح خلیفہ کے انتخاب اور امت کے سامنے جواب دہ ہونے کا تصور ختم ہو گیا۔ اگرچہ بیعت اب بھی قائم تھی لیکن اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ اس کے ذریعے نئے خلیفہ کی اطاعت کا اعلان کیا جائے۔ اس دور میں دو بیعتوں کا رواج ہو گیا تھا۔ ایک بیعت عامہ اور ایک بیعت خاصہ۔ بیعت خاصہ میں فوجی سپہ سالار، امرا اور قضاۃ شامل ہوتے تھے اور بیعت عامہ میں عوام ہوتے تھے۔ بیعت عامہ علاقے کے والی یا قاضی کے ہاتھ پر کی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو عملاً امور سلطنت میں کوئی دخل نہیں تھا۔ ۲۳۲ھ میں متوکل کے دور میں ترکوں کا غلبہ ہوا اور ۳۳۰ھ تک حل و عقد کے اختیارات صحیح معنوں میں انہی ترک امرا کے ہاتھوں میں رہے۔ مفوض، ابوالعباس بن موفق، مقتدر، ابن معتز اور قاہر باللہ انہی فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں تخت نشیں اور معزول ہوتے رہے۔ اس کے بعد

بویہہ برسر اقتدار آئے۔ انھوں نے خلیفہ کے اختیارات مکمل طور پر چھین لئے۔غزالی کے الفاظ میں
" ان دنوں حکومت کا یہ حال ہے کہ یہ کلی طور پر فوجی حکومت بن کر رہ گئی ہے۔ جس کسی کو
یہ فوجی جرنیل خلافت کے لئے نامزد کر دیں وہی خلیفہ ہو جاتا ہے۔[۲۰]"

اس تاریخی جائزے سے ہم بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اموی دور میں قبائلی اور عصبی قوت حل وعقد کے اختیارات استعمال کر رہی تھی اور عباسی دور کے اواخر میں یہ پورے طور پر فوجی جرنیلوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ علما اور قضاۃ کو فوجی جرنیلوں کا سا قوت واختیار حاصل نہیں تھا۔ تاہم ان کو سلطنت کے زعماء میں شمار کیا جاتا تھا اور بیعت خاصہ میں شامل رکھے جاتے تھے۔ قانونی اور فقہی امور میں ان کی رائے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ کبھی ان سے اجماعی فتویٰ نہیں لیا گیا۔ بلکہ اکثر ان کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ امور سلطنت میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیں۔ یہ بظاہر کچھ ناروا سا معلوم ہوتا ہے لیکن بہر طور اس سے اس حقیقت کی غمازی ضرور ہوتی ہے کہ ان کو بھی اہل حل وعقد کا جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا۔

(۲)

مندرجہ بالا تاریخی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حل وعقد کسی متعین گروہ یا مجلس کا نام نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس اصطلاح کا اطلاق ان تمام ارباب اختیار پر ہوتا رہا ہے جنھیں حل وعقد کے اختیارات حاصل تھے (فارسی میں " ارباب بست وکشاد" اس سے بڑی دلچسپ لغوی اور معنوی مشابہت رکھتا ہے)، قرآن مترادف معنی میں اولی الامر کا لفظ استعمال کرتا ہے اور ان کی اطاعت واجب قرار دیتا ہے۔[۲۱]

اولین دور کے مفسرین نے اولی الامر کی تفسیر میں عموماً امراء اور عمال کو شامل کیا ہے اگرچہ بعض نے اس کا اطلاق محض سرایا کے امیروں پر کیا ہے۔[۲۲] بعض نے اس سے خلفائے راشدین[۲۳] اور بعض نے ائمہ معصومین[۲۴] مراد لیا ہے۔ امام اشعری جنھوں نے واضح طور پر اہل حل وعقد کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے اہل علم ومعرفت مراد لیتے ہیں۔[۲۵] رازی[۲۶]۔ شہاب الدین مالکی[۲۷]۔ نسفی اور جمہور اصولیین کے ہاں اس سے علماء اور اہل اجتہاد مراد ہیں۔[۲۸] سعد الدین تفتازانی نے اس کے مفہوم میں علماء کے ساتھ ساتھ سرکردہ ارباب ملت کو بھی شامل کیا ہے۔[۲۹] شاہ ولی اللہ ان میں فوجی امراء کو بھی شامل کرتے ہیں۔[۳۰]

اصولیین کے ہاں اس کی تعبیر میں اختلاف کی بڑی وجہ سیاسی صورت حال رہی ہے چنانچہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اصولیین ان کے وظیفے کے تعین میں اختلاف کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے دائرۂ اطلاق کو وسیع یا تنگ کرتے رہے ہیں۔ جن اصولیوں نے محض تشریع اور قانون سازی تک حل وعقد کے دائرۂ عمل کو محدود دیکھا انھوں نے مجتہدین اور علما کو اہل حل وعقد قرار دیا جبکہ جنھوں نے ذرا وسعت دے کر قضا اور عدل کو بھی اس مفہوم میں شامل کیا انھوں نے قضاۃ اور شرطہ کو بھی اہل حل وعقد کے دائرے میں لے لیا۔ دراصل ان دنوں نظام حکومت نہ آج کی طرح پیچیدہ تھا کہ اختیارات کی تقسیم اور تحدید کا مسئلہ زیر غور آتا۔ نہ آج کی طرح منظم تھا کہ ان اداروں کا تعین ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے تینوں بڑے شعبے عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ اس کے تحت لئے جا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصولیین کے ہاں اس بارے میں اختلاف ہے۔ عام طور پر اہل حل وعقد سے بحث کرتے ہوئے وہ ان کے دو وظیفے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ انتخاب خلافت:

فقہا کے نزدیک یہ سب سے اہم فریضہ رہا ہے۔ اگرچہ عملاً ان کی حیثیت صرف بیعت کرنے والوں کی تھی لیکن فقہا نے انھیں انتخاب کنندگان میں شمار کیا ہے۔ اسی لئے ان کے نزدیک امامت کے انعقاد کے لئے اہل حل وعقد کی رضامندی لازمی ہے۔ ماوردی کہتے ہیں۔

وانعقدت بیعتھم لہ الامامۃ۔ فلزم کافۃ الامۃ الدخول فی بیعتہ والانقیاد لطاعتہ۔	ان (اہل حل وعقد) کی بیعت سے اس (مبایع) کی امامت منعقد ہو گئی۔ چنانچہ تمام پر اس کی بیعت کرنا اور اس کی اطاعت کرنا واجب ہو جاتا ہے[31]

چنانچہ جب اہل حل وعقد کسی کی خلافت پر متفق ہو جائیں تو امت پر ان کی اطاعت واجب ہے۔ اس سے دور جدید کے مفکرین کو بھی اتفاق ہے۔ رشید رضا لکھتے ھیں۔

فھؤلاء (ای جماعۃ اھل الحل والعقد) اذا اتفقوا علی امر او حکم وجب ان یطاعوا فیہ۔	پس یہ لوگ (اہل حل وعقد) اگر کسی امر پر متفق ہو جائیں تو ان کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے[32]۔

فقہانے یہاں ایک اور دلچسپ سوال پیدا کیا ہے کہ اگر اہل حل وعقد کسی کی امامت پر اتفاق کرلیں، لیکن وہ شخص رضامند نہ ہو تو کیا صورت ہوگی۔ ماوردی اور جمہور فقہا کے نزدیک اگر وہ شخص انکار کر رہا ہو تو اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا[۳۳]۔ لیکن تمام فقہا کو اس سے اتفاق نہیں[۳۴]۔

اس ضمن میں دوسرا سوال یہ ہے کہ اہل حل وعقد میں سے کم ازکم کتنے افراد کا اتفاق ضروری ہے اس سلسلے میں فقہا سے حیران کن حد تک مختلف اقوال منقول ہیں۔ ان کی تعداد ایک سے لے کر چھ تک بیان کی جاتی ہے۔ ماوردی نے فقہا کے اس اختلاف سے بحث کے لئے الگ باب باندھا ہے۔ فقہائے اہل سنت عموماً اہل حل وعقد میں سے صرف ایک کی رائے کو امامت کے انعقاد کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اشعری[۳۵]، ماوردی[۳۶]، ابن ہمام[۳۷]، غزالی[۳۸] اور قاضی عضدالدین[۳۹] سب اسی اصول کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا انعقاد صرف ایک شخص حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے ہوا تھا۔

اس ضمن میں ماوردی نے ایک گروہ کی یہ دلیل بھی نقل کی ہے کہ حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ تاکہ لوگ کہیں کہ نبیؐ کے چچا نے نبیؐ کے چچا زاد کی بیعت کرلی ہے۔ اور اس پر کوئی جھگڑا نہ ہو۔ یہاں تک کہ دو آدمی بھی اس سے اختلاف نہ کریں۔ اس سے نتیجہ نکالتے ہوئے ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح حضرت عباسؓ اکیلے حضرت علیؓ کی خلافت کی تجویز کرنے والے تھے۔ لہذا صرف ایک شخص کی نامزدگی بھی قانونی حیثیت رکھتی ہے[۴۰]۔

کوفیوں کا تو عموماً یہی عقیدہ رہا کہ خلافت کے لئے اہل حل وعقد میں سے صرف ایک شخص کی نامزدگی کافی ہے۔ لیکن دوسرے فقہا عام طور پر اکثریت کے اتفاق کے قائل رہے۔ بلکہ ابوبکر الاصم (۲۴۶ھ) مشہور معتزلی کا عقیدہ تھا کہ امامت کے انعقاد کے لئے جمہور امت مسلمہ کا اتفاق ضروری ہے تاہم کم ازکم تعداد جس پر بالعموم اتفاق رہا، پانچ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکرؓ کی پہلی بیعت میں پانچ صحابہ شامل تھے۔ حضرت عثمانؓ کے انتخاب کرنے والوں کی تعداد بھی یہی ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک خلافت کے انتخاب کے لئے کم ازکم پانچ کا اتفاق ضروری ہے۔

ب۔ تشریح۔

یہ اس مجلس کا بنیادی فریضہ ہے۔ مسلم معاشرہ کے نشو و ارتقا کے لئے پیش آمدہ مسائل کا

حل تلاش کرنا ضروری تھا۔ فقہائے اہل حل وعقد سے مراد ہی مجتہدین لئے ہیں چنانچہ شہاب الدین مالکی اجماع کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

الاجماع ھو اتفاق اھل الحل والعقد من ھذہ الامۃ فی امر من الامور ونعنی باھل الحل والعقد المجتھدین فی الاحکام الشرعیہ۔

اجماع سے مراد امت کے اصحاب حل وعقد کا کسی امر پر اتفاق ہے اور اہل حل وعقد سے ہماری مراد شرعی احکام میں اجتہاد کے اہل لوگ ہیں[41]۔

امام رازی کے نزدیک علما کو اسی لئے اہل حل وعقد میں شمار کیا گیا ہے کہ وہ قانون سازی میں حصہ لیتے ہیں۔

ان الاجماع لاینعقد الابقول العلماء الذین یمکنھم استنباط احکام اللہ من نصوص الکتاب والسنۃ، وھٰؤلاء ھم المسمون باھل الحل والعقد۔

اجماع حقیقتاً ان علما کے قول کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتا، جنھیں کتاب وسنت کی نصوص سے احکام الٰہی کے استنباط کی قدرت ہو اور انہی (علما) کو اہل حل وعقد کا نام دیا گیا ہے[42]۔

اس بارے میں سب سے اہم مسئلہ جو سب سے زیادہ نظرانداز رہا ہے اس ادارے کی تشکیل کا مسئلہ ہے اصولیین کے ہاں جو انتشار اور اختلاف ہے اس کی بڑی وجہ بھی یہی الجھن ہے۔ اور اسی کی وجہ سے خود یہ تصور بے حد مبہم ہو گیا ہے۔ دستوری قانون کی تشکیل میں انھوں نے ہمیشہ تاریخ کی تعبیر سے کام لیا۔ جیسا کہ موضوعِ زیربحث سے واضح ہو چکا ہے۔

ایک لحاظ سے یہ بہت ہی مناسب طریق کار تھا کہ بدلتے ہوئے حالات کے لئے قانون میں لچک رکھی جائے۔ یہ بات خود ان بیدار مغز فقہا کی خواہشوں کے برعکس ہو گی کہ ہم آئندہ کے لئے اس طرز فکر کو ختم کر دیں اور ایک قسم کی رجعت پرستی کو اپنا لیں جس سے ہم وقت کے ایک مختصر سے وقفے میں محدود ہو کر رہ جائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس تصور میں ایسی مبادیات موجود ہیں جو ہمارے سیاسی نظام کی اساس بن سکتی ہیں۔ اس کی جزئیات میں جہاں خلا نظر آتا ہے اسے ہم جدید وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پُر کر کے قابل عمل بنا سکتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ تاریخ میں اس کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں مثلاً

حدثنا میمون بن مہران قال کان ابوبکر اذا ورد علیہ الخصم نظر فی کتاب اللہ فان وجد فیہ مایقضی بینھم قضی بہ وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول اللہ فی ذالک الامر سنۃ قضی بہ فان اعیاہ خرج، فسال المسلمین وقال اتانی کذا وکذا فھل علمتم ان رسول اللہ قضی فی ذلک بقضاء فربما اجتمع الیہ النفر کلھم یذکر عن رسول اللہ فیہ قضاء فیقول ابوبکر الحمد للہ الذی جعل فینا من یحفظ علی نبینا۔ فان اعیاہ ان یجد فیہ سنۃ من رسول اللہ جمع روؤس الناس وخیارھم فاستشارھم، فاذا اجتمع رایھم علی امر قضی بہ۔

سنن الدارمی، جزء اول، صفحہ ۵۸، دمشق (مطبعۃ اعتدال) ۱۳۴۹ھ

سنن الکبری، بیہقی، جزء ۱۰، صفحہ ۱۱۴ دکن (دائرۃ المعارف العثمانیہ) ۱۳۵۵ھ

اس کے علاوہ ابن اثیر نے صحیحین سے نقل کیا ہے کہ شام کی وبا کے بارے میں حضرت عمرؓ نے مشورہ عام کیا۔

ابن اثیر، الکامل، جزء ثانی، صفحہ ۲۳۶، قاہرہ ۱۲۹۰ھ

۲۔ دیکھئے ابن المقفع رسالۃ الصحابہ صفحہ ۱۲۱۔ مجموعہ "رسائل البلغا" لجنۃ التالیف والنشر (۱۹۵۴ء)

۳۔ ابن قتیبہ الدینوری، الامامہ والسیاسۃ، صفحہ ۴۵-۴۶ مطبعہ مصطفیٰ محمد، ثانی،

۴۔ ابن ہمام، المسائرہ، صفحہ ۲۸۱، ۲۸۲، مطبعۃ الکبری الامیریہ، ۱۳۱۷ھ

۵۔ فقہ کی کتب میں تشریع کے ضمن میں یہ اصطلاح کثرت سے مستعمل ہے۔

۶۔ ابن تیمیہ، منہاج السنۃ، جلد دوم صفحہ ۲۰۴، ۱۳۲۱ھ

۷۔ ابوالحسن علی اشعری، کتاب الابانہ صفحہ ۶۷، حیدرآباد دکن ۱۹۴۸ء

۸۔ سیف الدین آمدی الاحکام فی اصول الاحکام جلد اول ص ۳۱۹ مطبعہ معارف ۱۹۱۴ء

۹۔ شہاب الدین ابوالعباس مالکی، شرح تنقیح الفصول، ص۱۴۰ مطبعہ خیریہ ۱۳۰۶ھ
۱۰۔ ابن جریر طبری۔ تفسیر جامع البیان، جزء ۸، ص۴۹۹، دار المعارف، مصر (ت ن)
۱۱۔ فخر الدین رازی، مفاتیح الغیب، پہلا ایڈیشن صفحہ ۲۴۳ مطبعہ خیریہ، مصر ۱۳۰۸ھ
۱۲۔ سیوطی، تاریخ الخلفا، صفحہ ۲۴۸ مطبع مجیدی، کانپور، ۱۳۳۱ھ
۱۳۔ ایضاً صفحہ ۲۴۹؛ الفاظ یہ: ولم یل الخلافۃ قبلہ احد اصغر منہ
۱۴۔ ابن طباطبا المعروف بابن الطقطقی، الفخری فی الآداب السلطانیہ، صفحہ ۱۲۸، قاہرہ، ۱۳۱۹ھ
۱۵۔ اشعری، حوالہ سابقہ ص۴۹
۱۶۔ ابن قتیبہ، حوالہ سابقہ ص۲۵
۱۷۔ طبری، تاریخ الامم والملوک، جلد پنجم ص۱۵۲، مطبعہ حسینیہ مصر (ت۔ ن)
۱۸۔ سیوطی، حوالہ سابقہ، صفحہ ۱۵۸
۱۹۔ ابن عبد ربہ، العقد الفرید، کتاب الخطب، خطبہ منصور، جلد ۴، صفحہ ۹۹، مطبع لجنۃ التالیف، قاہرہ، ۱۹۴۴ء
۲۰۔ غزالی، احیاء علوم الدین، جلد دوم ص۱۳۳، قاہرہ ۱۳۵۲ء
بحوالہ H.A.R. Gibb, STUDIES ON THE CIVILIZATION OF ISLAM, London (1962) P.143, 144 n.
۲۱۔ القرآن: ۴: ۵۸
۲۲۔ حضرت ابن عباس اور حضرت لیث سے طبری نے یہ قول نقل کیا ہے۔
۲۳۔ طبری۔ جامع البیان، حوالہ سابقہ
۲۴۔ رشید رضا، المنار، جزء ۵، ص۱۸۶ قاہرہ (۱۹۵۶ء) مختلف اقوال منقول ہیں۔
۲۵۔ اشعری، مقالات الاسلامیین، جلد دوم ص۱۳۲، قاہرہ ۱۹۵۴ء
۲۶۔ رازی، حوالہ سابقہ ص۲۴۵
۲۷۔ شہاب الدین مالکی، حوالہ سابقہ ص۱۴۰

۲۸۔ نسفی، ابوبرکات، مدارک التنزیل، جلداول، جزء ۵، ص۳۲۷، امیریہ بولاق ۱۹۳۶ء
۲۹۔ سعدالدین تفتازانی، شرح مقاصد
۳۰۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، جلداول ص۱۱۱، مطبعہ خیریہ، ۱۳۲۲ھ
۳۱۔ ماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص۴، مطبعہ الوطن، ۱۲۹۸ھ
۳۲۔ رشید رضا، حوالہ سابقہ ص۱۸۱
۳۳۔ ماوردی، حوالہ سابقہ ص۶
۳۴۔ شیرازی، تنبیہ ص۳۱۱ بحوالہ
Levy, Social Structure of Islam, Cambridge, (1957) P.287 F.N.1
۳۵۔ اشعری، حوالہ سابقہ ص۱۳۳
۳۶۔ ماوردی، حوالہ سابقہ ص۵-۶
۳۷۔ ابن ہمام، حوالہ سابقہ
۳۸۔ غزالی، الاقتصاد فی الاعتقاد، ص۱۰۵، ۱۰۶، قاہرہ دت۔ن،
۳۹۔ قاضی عضدالدین، مواقف، جلد ۷، ص۳۵۳
۴۰۔ ماوردی، حوالہ سابقہ

لیکن ہمیں اس واقعہ کی صحت میں کلام ہے۔ حضرت عباسؓ کا ۳۲ھ میں انتقال ہوگیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ میں ہوئی، اس لئے اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ واقعہ حضرت علیؓ کی جانشینی کے وقت ہوا۔ تو انتہائی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں کہ آپ نے یا تو حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے زمانے میں کہا ہو یا وصیت کے وقت، لیکن اس کے لئے بھی ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں، حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب پر تمام اہل مدینہ نے ان کی بیعت کرلی تھی اس لئے فلا یختلف علیک اثنان کہنا خلاف واقعہ ہوگا۔ دوسری صورت میں کہ انتقال کے وقت فرمایا ہو، واقعات اس کی بھی توثیق نہیں کرتے۔ کیونکہ حضرت علیؓ نے کبھی حضرت عباسؓ کے اس قول کا ذکر نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس کی بنیاد پر حق خلافت کا ادعا کیا۔ ورنہ طلحہؓ اور زبیرؓ سے بیعت کا اس قدر اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

۴۱۔ مالکی، حوالہ سابقہ
۴۲۔ رازی، حوالہ سابقہ